احمق تماشائی

نمرہ احمد

بارش کے قطرے ٹپ ٹپ کھڑکی کے شیشے پر پھسل رہے تھے۔ کافی دیر ہوئی طوفان ختم چکا تھا اور اب مینہ کی آخری بوندیں گر رہی تھیں۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھے، قلم انگلیوں میں گھماتے.... کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قلم کا ڈھکن اتار کر کاغذوں کے اس پلندے پر رکھا ہوا تھا جو اُن کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ وہ شاید کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں پا رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر تفکر کی لکیریں عمر

کی لکیروں سے زیادہ تھیں۔ عمر بھی کم نہ تھی قریباً پچاس کے لگ بھگ تو ہوں گے۔ بال قلموں سے سفید اور مونچھیں سرمئی تھیں۔ تنہا زندگی کی ساری داستان پیشانی پہ رقم تھی۔

تنہائی اور قلم..... بس دو ہی ساتھی تھے اُن کے۔ جب شادی کی عمر تھی تو کوئی پسند نہیں آئی۔ عمر گزر گئی تو بہتوں کو وہ پسند نہ آئے۔ اب تو عرصہ ہوا انہوں نے کسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس اخبار کا دفتر تھا اور ان کی پرانی سوزوکی تھی، یہ اچھے وقتوں کا اماں، باوا کا چھوڑا ہوا مکان تھا اور قلم تھا۔ زندگی میں ان تین چار چیزوں کے علاوہ ان کا کوئی قیمتی اثاثہ نہ تھا۔ ہاں ایک بہن تھی جو عرصے سے امریکا میں مقیم تھی۔ تین چار سال بعد ایک چکر لگا لیتی، سوئیٹرز اور جوتے لے آتی (شاید وہاں یہی دو چیزیں سستی ملتی تھیں) شادی کر لینے پر لیکچر دیتی اور بچوں کو ان کی سوزوکی میں سیر کروا کر واپسی کی اڑان بھر لیتی۔

وہ روزانہ کا کالم لکھتے تھے۔ کبھی سیاست، کبھی ثقافت، کبھی معاشرت اور کبھی مذہب۔ موضوع ختم نہیں ہوتے تھے سیاہی ختم ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھار سوچ بھی ختم ہو جاتی تھی جیسے ابھی وہ قلم کھول کر بیٹھے کچھ نہ لکھ پا رہے تھے۔ موضوع تھا ان کے پاس مگر الفاظ جانے کہاں جا سوئے تھے۔ شاید ذہن تھکن کا شکار تھا۔ انہوں نے کھلا قلم دھیرے سے کاغذوں کے پلندے پر ڈالا اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی نم ہوا سرعت سے اندر داخل ہوئی تھی۔ کاغذوں کے کنارے پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ انہوں نے پیپر ویٹ اٹھا کر ان پر رکھا اور باہر بھیگے منظر کو دیکھنے لگے جہاں بارش اب دم توڑنے کو تھی۔

ان کی زندگی کی طرح کمرے کا رخ بھی بدقسمتی کا شکار تھا۔ کھڑکی کے باہر کوئی خوب صورت ہرا بھرا پہاڑ نہیں، کوئی نیلی جھیل نہیں، کوئی سرسبز گھاس اور خوشنما پھولوں سے مزین لان نہیں بلکہ پکی اینٹوں کا چھوٹا سا صحن تھا۔ سپاٹ، خشک صحن جو گھر کے پچھلی سمت تھا اور اس کے اختتام پر چار دیواری تھی۔ اِدھر تمام گھر ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے۔ صحن چھوٹے اور کمرے زیادہ تھے۔ دیوار کے ایک طرف کی آواز دوسری طرف بنا کسی دقت کے سنی جا سکتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے داہنے ہاتھ کی طرف واقع گھر سے کافی عرصے سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ پچھلے کرائے داروں نے مکان خالی کر دیا تھا اور کچھ روز پہلے جب وہ راہ چلتے اپنے ہمسائے (مالک مکان) سے ملے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ آج کل وہ کرائے دار کی تلاش میں ہے۔

وہ جس رخ پر بیٹھے تھے وہاں سامنے کھڑکی کے باہر تین اطراف دیواریں تھیں۔ ان کے بالمقابل دیوار پر پیلی روشنی پڑ رہی تھی۔ غالباً ساتھ والے گھر کے ٹیرس سے آ رہی تھی۔ درحقیقت یہ گھروں کی بیک سائڈ تھی تو ٹیرس کے بجائے بالکونی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ معلوم نہیں کس چیز کی روشنی تھی۔ شاید لیمپ وغیرہ جلا ہوا تھا۔ یقیناً نئے کرائے دار آ گئے تھے۔ وہ ایک اچٹتی نظر اس اندھیرے میں روشن ہوئی دیوار پر ڈال کر واپس کاغذوں کے پلندے کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ ایک دم سے ایک آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی، انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

دائیں جانب والے گھر سے وہ آواز آ رہی تھی۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز، نسوانی آواز جیسے کوئی کم عمر لڑکی رو رہی تھی۔ سامنے دیوار پر روشنی میں انہیں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ وہ غالباً بالکونی میں لٹکے لیمپ کے آگے بیٹھی تھی، تبھی اس کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔

انہوں نے کاغذ ایک طرف کیے اور میز سے اپنا نظر کا چشمہ اٹھا کر لگایا۔ منظر اب صاف دکھائی دینے

لگا تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر بغور دیکھنے لگے۔ وہ کوئی لڑکی تھی جو گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کی اونچی پونی ہوا میں جھول رہی تھی۔ ماتھے پر آگے سے کٹے ہوئے بالوں کا خاکہ سا بنتا تھا۔ اس کا چہرہ اور نقش تاریکی میں ڈوبے تھے، وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی اور اس کی سسکیاں گیلی دیواروں پہ اتر رہی تھیں۔ اس کی آواز میں کم عمری کا الھڑ پن تھا اور سائے میں ایک دلکش سراپے کی رعنائی تھی۔ وہ بہت درد سے رو رہی تھی جیسے بہت تکلیف میں ہو، اس کا دکھ سارے ماحول پر چھانے لگا تھا۔

بارش ختم ہو چکی تھی مگر اس کے آنسو نہیں ڈبو رہے تھے وہ یک ٹک، گم صم بت بنے اس ہولے ہولے کانپتے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کون تھی، اسے کیا غم تھا، وہ اتنی بے بسی اور تڑپ سے کیوں روئے جا رہی تھی، وہ جاننا چاہتے تھے مگر جان نہیں سکتے تھے سو اسی طرح بیٹھے اسے دیکھتے رہے جس کا سایہ آدھی دیوار پر محیط تھا۔ شاید وہ لیمپ کے بہت قریب بیٹھی تھی۔

کتنے لمحے بیت گئے، وہ یونہی روتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی سسکیاں تھمتی گئیں اور پھر ایک دم سے لیمپ بجھ گیا۔ سامنے والی دیوار تاریک ہو گئی اور اُن کا منظر ختم ہو گیا۔ دفعتاً دائیں جانب کے گھر کی بالکونی سے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور پھر چٹخنی چڑھنے کی۔ وہ شاید اندر چلی گئی تھی۔ اب وہاں بیٹھنا بے سود تھا۔

کالم کا موضوع اور خیال ان کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے بے دلی سے قلم کو کیپ چڑھائی اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

صبح راہ چلتے پھر سے اُن کی ہمسائے سے ملاقات ہو گئی۔ وہ دراصل اُن کے ہمسائے والے گھر کا مالک مکان تھا۔ رہتا ایک گلی چھوڑ کر تھا۔ یہ گھر اس نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔

"رشید صاحب....." وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو روک بیٹھے۔ "آپ کا گھر کرائے پر چڑھا؟"

"ہاں جی، اللہ کا شکر ہے، کراچی سے ایک فیملی آئی ہے، پورا گھر انہوں نے ہی لے لیا ہے۔"

"اچھا، یہ تو اچھی بات ہے، بڑی فیملی ہوگی یقیناً؟"

"ارے نہیں، فیملی تو چھوٹی سی ہے، میاں، بیوی اور ایک بیٹی۔ بس امیر لوگ ہیں، پرائیویسی چاہتے ہیں سو پورا گھر لے لیا بلکہ اوپر والا پورا پورشن بیٹی کے لیے ڈیکوریٹ کر رہے ہیں۔"

"اچھا..... اچھا..... اچھے لوگ ہوں گے پھر تو؟"

"ہاں جی۔" اور وہ جان گئے تھے کہ یہی "بیٹی" رات میں رو رہی تھی۔ ماں، باپ اتنے پیار کرنے والے تھے پھر بھی رو رہی تھی؟ جانے کیا بات تھی۔

رات وہ کالم لکھنے بیٹھے تو کچھ سوچ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ کل کی بارش کے باعث آج قدرے حبس تھا۔ باہر صحن تاریکی میں ڈوبا تھا۔ صحن میں وہ کبھی کوئی بھی بتی یا بلب نہیں لگوا سکے تھے۔ دھیان ہی نہیں دیا کبھی۔ یہ کام تو ویسے بھی بیویوں کی توجہ دلانے پر ہی ہوتے ہیں، خود سے کہاں خیال آ سکتا تھا ان کو۔ البتہ آج اُن کو اس بات کی خوشی تھی ورنہ اگر صحن روشن ہوتا تو برابر والی کے لیمپ کی روشنی اِدھر نہ پڑتی۔

وہ کالم لکھنے لگے۔ کل کا ناغہ کیا تھا سو آج مستعدی سے قلم چلانے لگے۔ الفاظ بھی تھے، موضوع اور نتائج بھی۔ ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے کہ وہی مدھم نسوانی آواز تاریکی میں سنائی دی۔ قلم روک کر

انہوں نے بے اختیار سر اٹھایا۔

سامنے دیوار پہ پیلی روشنی پڑ رہی تھی اور اس میں ایک سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُسی لڑکی کا سایہ۔ وہ اسی طرح دائیں پہلو بیٹھی تھی۔ اس کی پونی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ماتھے پر کٹے بال بھی اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ آج وہ سر جھکائے نہیں بلکہ سر اٹھائے بیٹھی تھی۔

''کرسٹوفر!'' وہ گہری تاریکی میں ہولے سے بولی تو وہ چونک اٹھے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

دیوار پر پڑتے زرد عکس میں آہستہ سے کوئی چلتا ہوا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ وہ لمبا سا لڑکا تھا۔ اس کے بال گھنگرالے اور ناک لمبی تھی۔ وہ اب ان دونوں کا سائڈ پوز دیکھ سکتے تھے جو آمنے سامنے موجود تھے۔ لڑکی سر اٹھا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہم ساری زندگی اِدھر بند رہیں گے... کرسٹوفر؟'' وہ بہت دکھ سے کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک سے گئے۔

''مجھے کرسٹوفر مت کہو کیتھی، مجھے کرس کہو، ہمارے ڈیڈ کا بھی تو یہی نام تھا نا۔'' لڑکے کی آواز قدرے بھاری تھی۔

''مگر اب ڈیڈ نہیں رہے اور ہم یتیم ہو چکے ہیں۔ اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔''

''مما تو ہیں، مما ہم سے پیار کرتی ہیں کیتھی، ٹرسٹ ہر۔'' ان کے سائے بالکل ساکت تھے۔ دکھ بھی ایسے ہی اُن کے لہجوں میں ٹھہر گیا تھا۔

''مجھے مما پر بھی ٹرسٹ نہیں رہا۔ وہ جب ہمیں یہاں لے کر آئی تھیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں بس ایک دن اس کمرے میں بند رہنا ہوگا کہ اُن کے پاپا کو پتا نہ چلے اور وہ جلد ہی ہمارے نانا کا پیار حاصل کر کے اُن کو اپنی وصیت بدلنے پر مجبور کر دیں گی۔ پھر کچھ دنوں میں نانا مر جائیں گے اور ساری دولت ہماری ہوگی مگر یہاں آ کر کیا ہوا؟ ہم کتنے دنوں سے یہاں بند ہیں اور مما کو ہمارا خیال ہی نہیں۔''

''مما پر بھروسا رکھو کیتھی۔''

''نہیں کرس..... مما اپنے پیرنٹس کے ساتھ اُن کی دولت میں اتنی مگن ہیں کہ انہیں بھول چکا ہے کہ اُن کے بچے یہاں اوپر اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہیں، اگر اس گھر کو آگ لگ گئی اور ہم مر گئے تو کسی کو علم بھی نہیں ہوگا کیونکہ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اس محل میں صرف مالکم، اس کی بیوی اور بیٹی رہتے ہیں۔ لوگوں کو کیا پتا کہ ظالم مالکم کے گرینڈ چلڈرن اوپر قید ہیں، صرف اپنی ماں کی خود غرضی کی وجہ سے۔''

''کیتھی.....'' اور پھر وہ بولتے بولتے رکا۔

''کوئی آ رہا ہے، چلو۔'' شاید انہیں کوئی آواز آئی تھی تبھی ایک دم سے لیمپ بجھ گیا۔ تھوڑی سی کھٹر پٹر ہوئی اور پھر بالکونی کے دروازے کے بند ہونے اور چٹخنی چڑھنے کی آواز آئی۔

وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر اُن کی بالکونی میں جھانک ہی لیں یا صبح جا کر مالکم صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا کر سوال کر سکیں کہ ان کی بیٹی نے اپنے بچوں کو اوپر کیوں قید کر رکھا ہے۔ نانا کی وصیت..... چند دن بعد نانا کی متوقع موت..... ماں کی خود غرضی..... قید بچے..... وہ ٹین ایجرز تھے۔ پندرہ سولہ سال کے تو ہوں گے، ان کو یوں بند رکھنا تو ظلم تھا مگر وہ کس سے فریاد کرتے۔ کالم جیسے تیسے مکمل کر کے وہ رات گئے کرسی سے اٹھے تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

اس رات وہ قلم کاغذ لے کر کھڑکی کے سامنے بیٹھے تو یہ بات طے تھی کہ آج کالم اُن سے لکھا نہیں جانا اور وہ بس اپنی دیوار پر گرتے سائے دیکھنے کے لیے اُدھر بیٹھے تھے۔ ٹھیک دس بجے ان کو دیوار پر روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ انہوں نے بند قلم کپ میں دیگر قلموں کے ساتھ ڈال دیا (آج انہوں نے اسے کھولنے کا بھی تکلف نہیں کیا تھا) اور آگے ہو کر بیٹھے۔ دلچسپی و فکر مندی سے زرد روشنی میں ان دو ہیولوں کو دیکھنے لگے۔ لڑکی اسی طرح ایک سائڈ سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی بل دار اونچی پونی ہوا سے ہولے ہولے جھول رہی تھی۔ آج وہ سر سیدھے رکھے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں اُس کے مقابل اس کا گھنگرالے بالوں والا بھائی بیٹھا تھا۔ کیتھی اور کرسٹوفر۔

''کیا سوچ رہی ہو کیتھی؟''

''میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ہمارے ٹوئنز کو دیکھا ہے؟ وہ اب مما کو مس نہیں کرتے بلکہ روز بہ روز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔''

ٹوئنز؟ وہ چونکے تو کیا کیتھی کے ساتھ کوئی اور بچے بھی قید تھے؟ یقیناً ان کی جڑواں بہنیں یا بھائی۔

''ہاں، دونوں بہت کمزور ہوتے جا رہے ہیں مگر ہمیں سروائیو کرنا ہے کیتھی۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے اور تمہیں بیلرینا۔ ہمیں اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔''

''مما ہمیں کبھی یہاں سے نہیں نکالیں گی۔ وہ اب ہماری پروا کرنا چھوڑ چکی ہیں۔''

''ہمت کرو کیتھی۔'' وہ اسے کافی دیر سمجھاتا رہا مگر اس لڑکی کے لہجے کا کرب، اس کی آواز کی نمی..... ہر شے اُن کی روح پر اترتی چلی گئی۔

انہوں نے کالم لکھنا چھوڑ دیے۔ وہ بس ہر رات یونہی کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے۔ کمرے کی بتی گل کر کے، دونوں پٹ کھول کر چمکتی دیوار پر

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

فروری 2012ء سے شائع ہونے والی کہانیاں

سرگزشت

ماہنامہ

فخر سخن

ڈیڑھ سو سال قبل بنگال کی سرزمین پر اردو کی خدمت میں دلی و لکھنو کو پچھاڑ دینے والے شاعر کا زندگی نامہ

قابل تقلید

اس دوشیزہ کی روداد حیات جس نے پاکستانی عوام کی خدمت کے لیے جرمنی کو چھوڑا، وہ آدھی صدی سے کراچی میں ہے

سامری

اس جادوگر کا تذکرہ جس کے جادو نے دو نبیوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا

چیمپئن

ایک فالج کے مریض بچے کی روداد جو اس سال بھی اولمپک گیم میں تمغہ جیتنے کی تیاری کر رہا ہے

اس کے علاوہ

بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے

معلوماتی کہانیاں، فلمی تاریخ اور اردو ادب کے معماروں کی دلچسپ داستانیں

ایک ایسا شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

حرکت کرتے سائے دیکھتے رہتے۔ ان کی باتیں سنتے رہتے۔ پھر پورا دن سوچتے ہی رہتے کہ کبھی ان کے گھر جائیں یا کم از کم اپنی چھت پر چڑھ کر ان بچوں کو آواز ہی دے لیں اور نہیں تو جب رات میں وہ باتیں کر رہے ہوں تو باہر صحن میں آ کر ایک نظر اُن کی بالکونی کو دیکھ ہی لیں۔ جہاں وہ چینی کی مورت جیسے سراپے والی لڑکی بستی ہے، جو اپنی نانی کے مظالم اور ماں کی بے اعتنائی پہ شکوہ کناں رہتی ہے مگر وہ کبھی یہ ہمت نہ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ ایک روز دوپہر میں ڈرتے ڈرتے صحن میں نکل کر گردن اٹھائی تو دائیں گھر کی بالکونی سنسان پڑی تھی۔ اندر کھلنے والے دروازے تختی سے بند تھے۔ بس ایک کونے میں ایک سیدھی میز رکھی تھی۔ شاید وہ اسی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی ہمت نہ کر سکے... بلکہ اب تو انہوں نے اپنے گھر کی چھت پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اخبار کے دفتر بھی بس خانہ پُری کے لیے جاتے۔ کالم سے ناغہ لے لیا تھا۔ بس روز اُن کو رات کا انتظار رہنے لگا تھا۔ کب دس بجیں اور وہ دونوں بالکونی میں آ کر باتیں کریں۔

وہ روز اُن کی گفتگو سنتے تھے۔ وہ جس کمرے میں بند تھے۔ اس کے آگے کسی ایٹک کا ذکر کرتے تھے۔ شاید وہاں کوئی اسٹور روم تھا جہاں بہت چوہے تھے۔ ان کی ہر بات میں ایٹک ہوتا تھا یا پھر ماں سے نفرت یا نانی کے مظالم یا اپنے جڑواں، بہن اور بھائی کی گرتی حالت۔ پھر ایک روز انہیں اُن کی گفتگو سے علم ہوا کہ ان کا چھوٹا بھائی نمونیے کا شکار ہو گیا ہے... اور اگلی رات وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ ان کا بھائی مر چکا ہے۔ ہاں ان کا بھائی مر گیا اور اس لڑکی کا ہر آنسو اُن کے دل پر گرتا رہا۔

وہ کب کیسے اس کی محبت میں مبتلا ہو گئے، انہیں علم نہ ہو سکا۔ بس وہ ہر رات کھڑکی کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ کافی کے کپ پر کپ پیتے جاتے، دور کہیں گونجنے والی مدھم سرگوشیاں سنتے رہتے۔ کاغذوں کے پلندے پیلے پڑنے لگے تھے۔ بند قلم پر دھول جمنے لگی تھی۔ وہ تھے، اُن کی تنہائی تھی اور دیوار پر حرکت کرتے سائے تھے۔ زندگی بس یہیں تک محدود ہو گئی تھی۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور ان بچوں کو آزاد کروا لیں۔ ان کو اپنے گھر لے آئیں۔ اُن کو تحفظ اور پیار دیں۔ اور وہ لڑکی..... اسے وہ اپنا لیں۔ کیا ہوا جو ان کا دین ایک نہیں، وہ اگر مسیحی تھی تو وہ اس سے شادی کر سکتے تھے۔ مگر وہ اپسرا ان سے شادی کرنے پر کیوں راضی ہو گی بھلا؟ لیکن کیا پتا ہو بھی جائے۔ خوش گمانی میں حرج ہی کیا تھا۔

پھر ایک روز انہیں علم ہوا کہ وہ دونوں اپنی چھوٹی بہن کو لے کر یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ دور کہیں کسی اور شہر جانے کا جہاں ان کی ماں اور نانی ان کو تلاش نہ کر سکیں۔ اگر وہ چلے گئے تو ان کی تمنائیں ادھوری رہ جائیں گی بلکہ ان کی زندگی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ وہ کبھی خود کو مکمل نہیں کر پائیں گے۔ نہیں، انہوں نے ان کو جانے نہیں دینا۔ وہ ان سے بات کریں گے۔ ان کو اپنے پاس بلا لیں گے۔ ان کا ہر طریقے سے خیال رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اس رات وہ بہت بے چین سے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ اُدھر بالکونی میں کیتھی اور کرس باتیں کر رہے تھے۔

"مما یہاں سے چلی گئی ہیں، ہم اُن کا زیور نہیں چرا سکتے۔"

"مگر ہمارے پاس تھوڑے بہت پیسے تو جمع ہو گئے ہیں نا کرس، اب ہم یہاں سے نکل سکتے

ہیں۔"

"کل صبح چھ بجے کی ٹرین ہم پکڑ لیں گے۔"

"کیری کو راضی کرنا مشکل ہو گا۔" وہ اپنی بہن کی بات کر رہی تھی جس کا جڑواں چند روز قبل جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

"ہم راضی کر لیں گے، تم سامان پیک کرو کیتھی۔"

اور ان سے اب مزید صبر کرنا مشکل تھا۔ اپنی ساری بزدلی، کم ہمتی اور جھجک کو پس پشت ڈال کر وہ اٹھے اور سیڑھیوں کی طرف لپکے، انہیں اس لڑکی کو روکنا تھا۔ انہیں اس کو تحفظ دینا تھا، اسے زمانے کی ساری کٹھن گھاٹیوں سے بچانا تھا۔ اسے اپنے پاس لے آنا تھا۔ وہ تیز تیز سیڑھیاں پھلانگ رہے تھے ان کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ اس عمر میں بھاگنا ان کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا مگر وہ تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔

وہ اس کو روک لیں گے، اس کو اپنا لیں گے۔ اسے زندگی سے ساری خوشیاں کشید کر دیں گے، اس کے سارے غموں کو مٹا ڈالیں گے ہاں۔ وہ اسے خوش رکھیں گے، وہ اس کے لیے اس کی بہن اور بھائی کو بھی اپنے پاس لے آئیں گے۔ ان کی ظالم ماں اور نانی کو علم نہیں ہونے دیں گے، کسی صورت بھی نہیں۔ چھت کا دروازہ کھول کر وہ باہر آئے تھے۔ ان کی بالکونی اور ہمسائیوں کی بالکونی ملی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

وہ کیتھی کو یہاں سے لے جائیں گے۔ وہ کراچی یا پھر اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔ وہاں ان بچوں کی ماں اور نانی ان کو نہیں ڈھونڈ سکیں گی۔ وہ ان کی دسترس سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی بالکونی کے آخری سرے پر آ کر وہ رکے۔

بائیں طرف کی بالکونی نیم روشن تھی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر اس لڑکی کی بالکونی کے بالکل کونے پر وہ میز رکھی تھی۔ اس میز کے ساتھ وہ ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ وہ کیتھی نہیں تھی بلکہ ایک دس گیارہ سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کے کھلے بال کمر پر گر رہے تھے۔ وہ بہت محویت سے اپنی انگلیوں سے بندھے دھاگوں کو اوپر نیچے ہلا رہی تھی۔ دھاگوں کے دوسرے سرے پر میز پر رکھی دو کٹھ پتلیوں کے ہاتھ بندھے تھے۔ پہلی کٹھ پتلی ایک ہاتھ جتنی گڑیا تھی جس کی اونچی پونی تھی اور ماتھے پر کٹے ہوئے بال تھے۔ دوسری کٹھ پتلی بالشت بھر کا گھنگرالے بالوں والا گڈا تھا۔ وہ ایک تختے پر ان دونوں کو آمنے سامنے بٹھائے لیمپ کے آگے رکھے ہوئے تھی۔ اس کے قریب ہی ایک کتاب پڑی تھی جس کا سرورق ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

فلاورز ان دی ایٹک۔ وہ بالکل ساکت ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کل صبح چھ بجے کی ٹرین سے ہم جائیں گے۔"

"میں نے سارا سامان پیک کر لیا ہے کرس۔"

وہ باری باری ایک پتلی اور موٹی آواز نکال کر گفتگو کو آگے بڑھا رہی تھی۔ قریب ہی پڑے ایک کٹھ پتلی ڈرامے کے دعوت ناموں کی شہ سرخی وہ اتنی دور سے بھی پڑھ سکتے تھے۔ وہ ڈراما جس کی ریہرسل وہ کافی دنوں سے کر رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے گردن موڑ کر نیچے اپنی دیوار کو دیکھا جہاں دو خوب صورت سائے گر رہے تھے۔

البتہ کٹھ پتلیوں کا دھاگا بہت باریک تھا۔ اس کا سایہ نہیں بنتا تھا۔